ناول نگاری

دنیا میں ناول کو صنعتی عہد کے فروغ کے ساتھ جوڑ کر دیکھا جاتا ہے۔ قدیم تہذیبوں کے بطن سے داستان سرائی کی جو روایت دنیا کے مختلف گوشے میں موجود رہی، ناول کا ارتقا کہیں نہ کہیں ان روایتوں سے بھی ہم رشتہ رہا۔ موضوع کے اعتبار سے جاگیردارانہ تہذیب کے اوّلین بکھراو کو سمیٹنے کے لیے ناول نے کوششیں کیں۔ تکنیک کی سطح پر بدلتی دنیا کے آثار بھی سب سے پہلے ناول میں دکھائی دیتے ہیں۔ سترہویں صدی کے بعد کی دنیا میں جگہ جگہ ناول نگاری کی ابتدائی کوششیں دکھائی دے رہی ہیں۔ جرمنی، برطانیہ، فرانس اور روس میں ناول نگاروں کا ایک ایسا سلسلہ سامنے آیا جس سے تھوڑے وقفے میں ہی اس صنف کو اعتبار حاصل ہو گیا۔ موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے جدّت پسندی بہت تھی۔ جس کی وجہ سے اس صنف پر لوگوں کی عمومی توجہ ہو گئی۔ اس زمانے میں یہ عام بات تھی کہ شاعری عہدِ قدیم کی ترجمانی کرتی ہے اور ناول عہدِ جدید کی۔ لفظ ناول (Novel) کے لاطینی مآخذ 'Novella'' کا مفہوم بھی 'نیا' ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے بھی ناول کو نئی شے کے طور پر قبولیت ملی۔

اردو میں فارسی کے توسط سے داستانی سلسلے خاصی تعداد میں ملتے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج نے مختصر داستان گوئی کی طرف ہمارا دھیان کھینچا۔ ہندستانی معاشرے میں کسی صنعتی انقلاب یا بڑے سائنسی تغیر و تبدّل کا کوئی نشان اٹھارہویں صدی یا نصفِ اوّل انیسویں صدی میں دکھائی نہیں دیتا۔ شاید اسی لیے انیسویں صدی کے نصف اوّل تک تو داستانوں کی مقبول فضا بندی قائم رہتی ہے۔ 1857 کے انقلاب اور اس کے نتیجے میں انگریزوں کی جارحیت نے شاید پہلی بار ہندستانی سماج کو بالخصوص مسلمانوں کو نئے انداز میں غور و فکر کے لیے تیار ہونے کا موقع عطا کیا۔ اسے محدود معنوں میں نشاۃ الثانیہ یا نئی بیداری بھی کہتے ہیں۔ اہلِ اردو کے لیے داستانوں سے الگ عہدِ جدید کے تقاضوں کے ساتھ ناول جیسی صنف کے سائے میں پہنچنا، اِسی دور میں ممکن ہو سکتا تھا۔ سماجی ضرورتیں اور نئے سیاسی مسائل ہمیں مجبور کر رہے تھے کہ ادب کو گل و بلبل کے قصّے کہانیوں کی جگہ زندگی کے حقائق اور سماجی مسائل کے ساتھ جوڑ کر دیکھا جائے۔ سرسیّد نے کوئی تحریک نہیں شروع کی تھی لیکن ان کی یکے بعد دیگرے کتابیں قومی مسائل کو اجاگر کرنے میں کامیاب ہو رہی تھیں۔ سرسیّد جس سال برطانیہ کے لیے روانہ ہوئے، اُسی سال یعنی 1869 میں سرسیّد کی متوقع تحریک کے سرگرم رکن دہلی کی عظیم المرتبت علمی شخصیت ڈپٹی نذیر احمد نے 'مراۃ العروس' نام سے قصّے کی ایک ایسی کتاب لکھی جسے بعد کے زمانے میں اردو کا پہلا ناول قرار دیا گیا۔ نذیر احمد نے چھے اور ناول رقم کیے۔ تمام کتابوں میں قصّہ گوئی کی تان، قوم کی زبوں حالی اور اصلاحِ معاشرہ پر ٹوٹتی ہے۔ ایسے کسی قصّے کی روایت نذیر احمد کو اردو میں نہیں ملی تھی۔ بلاشبہ

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

انھوں نے بعد میں انگریزی ناولوں اور تمثیلوں سے فائدہ اٹھایا۔ اِس کے باوجود اس صنف کا ابتدائی خاکہ ان کی عالمانہ تخلیقی صلاحیت کی نگرانی میں انجام پایا۔

سرسیّد کی طرح ہی نذیر احمد کے دل میں مسلمانوں کی خستہ حالی کا نقشہ تھا۔ دونوں کے تصوّرات میں بعض مقامات پر بعدِ مشرقین ہے جس کا اظہار 'ابن الوقت' کے صفحات پر ہوتا ہے۔ نذیر احمد یہ مانتے تھے کہ مذہب سے دوری کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں اخلاقی گراوٹ آئی ہے۔ اس لیے جدید تعلیم کے ساتھ مذہبی اعمال پر بھی وہ توجہ دینے کی وکالت کرتے تھے۔ ان کے ناولوں میں سب سے بڑا موضوع یہی ہے کہ معاشرے کی جملہ خرابیوں کی وجہ ہماری بداعمالیاں ہیں۔ 'توبتہ النصوح' میں گھریلو زندگی میں تہذیبی، اخلاقی اور مذہبی گراوٹ کو انھوں نے واضح کیا۔ انگریزوں کے اثر سے جو برائیاں پیدا ہو رہی تھیں، نذیر احمد اُن پر اپنی واضح رائے رکھتے ہیں۔ انھیں وجوہات سے ان کے تمام ناول — 'مراۃ العروس'، 'توبتہ النصوح'، 'ابن الوقت'، 'بنات النعش'، 'رویائے صادقہ'، 'ایامیٰ' اور 'فسانۂ مبتلا' بے حد مشہور ہوئے اور ملک کے گوشے گوشے میں نذیر احمد کے رنگ میں ناول نگاری کا سلسلہ شروع ہوا۔ انیسویں صدی میں جتنے ناول نگار سامنے آئے، سب پر کسی نہ کسی جہت سے نذیر احمد کے گہرے اثرات قائم ہوئے۔

شادؔ عظیم آبادی کے نام سے ''صورۃ الخیال'' (ناول) شائع ہوا۔ اِس کی تین جلدیں مزید سامنے آئیں۔ تصنیفی حیثیت پر اچھی خاصی بحث ہوئی۔ شادؔ اِن ناولوں کے مصنف ہیں یا مؤلف، یہ بحث ابھی ختم نہیں ہوئی لیکن یہ سچّائی ہے کہ ان ناولوں پر نذیر احمد کا اصلاحی رنگ غالب ہے۔ حالیؔ کا ناول ''مجالس النسا'' اور رشیدۃ النسا کا ناول ''اصلاح النسا'' تو پورے طور پر نذیر احمد کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ ''اصلاح النسا'' میں بار بار نذیر احمد کا تذکرہ بھی ہوتا ہے۔ مصنّفہ نذیر احمد کی اصلاحی کوششوں کے لیے انھیں دعا دیتی ہیں۔ اصلاح کا عمومی انداز اس وجہ سے بھی اس عہد میں دیکھنے کو ملتا ہے کیونکہ سرسیّد کی تحریک شباب پر تھی۔ پورے ہندستانی معاشرے میں اصلاح اور تغیر وتبدّل کے موضوعات سکّۂ رائج الوقت تھے۔ اسی لیے ہر ناول نگار کے یہاں اپنے عہد کی ضرورتوں کے تحت لکھنے کا کام کہیں نہ کہیں اصلاحی رنگ کی طرف بڑھ جاتا تھا۔

اُسی زمانے میں عبدالحلیم شررؔ اور پنڈت رتن ناتھ سرشار نے ناول نگاری کا قدرے مختلف نگار خانہ سجایا۔ شررؔ تاریخ کے حوالے سے اپنی باتیں کہتے ہیں اور سرشار تہذیب وثقافت اور قدروں کو بنیاد بناتے ہیں۔ 1857 کے بعد ہندستانی سماج میں احساسِ زیاں پر سب متفکّر تھے۔ حکومت ختم ہونے کا احساس اور غیر اقوام کے زیرِ انتظام جینے کی بے بسی اُس زمانے میں عام طور پر غور وفکر کا موضوع ہے۔ عبدالحلیم شررؔ تاریخ کے مہتم بالشان ادوار کی طرف اپنے قصّے کی طنابیں کھینچتے ہیں۔ شررؔ کا سب سے مرغوب موضوع مسلمانوں کی افواج کے ذریعے یورپ کے ممالک کی تاراجی ہے۔ تہذیبی اعتبار سے بھی یہاں میل جول کی گنجایش پیدا ہوتی ہے۔ ایک رومانیت اپنے آپ ان قصّوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ نذیر احمد، سرسیّد اور حالیؔ سے شررؔ کا مزاج علاحدہ نہیں لیکن انھوں نے اپنے ناولوں کے موضوعات ایسے رکھے جن کا براہِ راست تعلّق ہندستانی معاشرے سے کم تھا لیکن شعورِ اقدار وہی تھا۔ عبدالحلیم شررؔ کے ناول بہت پڑھے گئے اور ان کی قدر و قیمت وقت سے طے ہوگئی۔ اس کی وجہ تاریخ اور مذہب کا وہ رومانی تصوّر تھا جو

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

وقتِ زوالِ اقوام کو زیادہ عزیز ہوتا ہے۔

رتن ناتھ سرشار نے ''فسانۂ آزاد'' لکھ کر ایک تہذیبی مرقع پیش کر دیا۔ ناقدین کا ایک طبقہ اس کی طوالت کی وجہ سے اسے داستان کے طور پر متعارف کراتا ہے لیکن تہذیب و ثقافت کا جو گہرا شعور سرشار کے یہاں موجود ہے، وہ عہدِ جدید کا عطیہ ہے۔ جس کی ترجمانی کے لیے ناول کو فضیلت حاصل ہوئی۔ نذیر احمد اور شرر کی روایات کے سامنے سرشار کی تحریروں کو رکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ناول کے مزاج کے اعتبار سے سرشار سب سے زیادہ پختہ شعور کے مالک ہیں۔ اکثر سرشار کو اُن کی ظرافت کے لیے داد فراہم کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن سچائی یہ ہے کہ سرشار اپنے بہترین سماجی تہذیبی شعور کی بدولت اردو ناول کی تاریخ میں ایک ایسی جگہ پر متمکن ہیں جہاں سے ناول کا عہدِ جدید شروع ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تکنیک کا جو نیا تصور اس زمانے میں آیا، سرشار اپنے ناولوں میں اسے کامیابی کے ساتھ نہیں آزما سکے۔ کرداروں کی تراش خراش اور قصے میں ایجاز کا ہنر بھی سرشار کے پاس کم تھا لیکن ناول کی روح یعنی اپنے عہد کی ترجمانی اور تہذیب و ثقافت کا شعور ایسے اجزا ہیں جن کی وجہ سے سرشار کو اردو قصہ گوئی کی تاریخ کی ایک عبقری (Legendary) شخصیت تسلیم کیا جاتا ہے۔ طنز و ظرافت کو بنیاد بنا کر ناول کو اپنے عہد کا ترجمان بنا دینا سرشار کا ایک کارنامہ ہے لیکن مثالیں اُسی عہد میں دوسرے لکھنے والوں کے ہاں بھی موجود ہیں۔ ''اودھ پنچ'' کے اڈیٹر منشی سجاد حسین نے کئی ایسے ناول لکھے جن کے کردار ظرافت کے پروں سے اڑتے ہیں۔ حاجی بغلول، کایا پلٹ اور میٹھی چھری ناولوں میں ظرافت کے پردے میں سماجی حقائق کا زبردست اظہار ملتا ہے۔ اس عہد میں قاری سرفراز حسین عزمی کا ناول ''شاہدِ رعنا'' سامنے آیا۔ طوائف کی زندگی پر یہ پہلا ناول ہے۔ عزمی کی زبان مرصّع ہے۔ کئی ناقدین نے 'شاہدِ رعنا' اور 'امراؤ جان' میں مماثلتیں دکھائی ہیں اور محدود پیمانے پر یہ الزام بھی رسوا کے سر آیا کہ 'شاہدِ رعنا' کے جواب کے طور پر رسوا نے 'امراؤ جان ادا' تصنیف کی۔ اس کا یہ بھی مطلب ہوتا ہے کہ ''امراؤ جان ادا'' کا نقشِ اوّل ''شاہدِ رعنا'' ہے۔ اس حقیقت کے باوجود ''شاہدِ رعنا'' اردو ناول کی تاریخ کی ایک غیر اہم کڑی سے زیادہ اہمیت کی حامل نہیں قرار دی جا سکی۔ 'مراۃ العروس' سے لے کر ''شاہدِ رعنا'' تک تقریباً تین دہائیوں میں اردو ناول نے مواد اور فن کی کئی منزلیں سر کیں۔ لیکن انیسویں صدی میں جس طرح عہدِ نو کے تقاضے ہمارا انتظار کر رہے تھے، وہاں تک اردو ناول کو پہنچنے میں دیر ہوئی۔ نذیر احمد، شرر اور سرشار میں سے کوئی ایک بھی اردو کے نئے ناول کا خاکہ نہیں کھینچ سکا۔ اس کے لیے اردو کو 1898 تک کا انتظار کرنا پڑا۔

''امراؤ جان ادا'' کی اشاعت سے اردو ناول کا عہدِ جدید شروع ہوتا ہے۔ مرزا محمد ہادی رسوا نے ''شریف زادہ''، ''ذات شریف''، ''افشائے راز'' جیسے کئی ناول لکھے لیکن انھیں بقائے دوام ''امراؤ جان ادا'' کی وجہ سے حاصل ہوا۔ یہ کہنا پورے طور پر صحیح نہیں کہ مرزا رسوا کے یہاں مقصدی ناول نگاری نہیں ہے۔ ''امراؤ جان ادا'' میں اصلاح اور تبلیغ کے بھرپور مواقع ہیں۔ اس کے باوجود اس ناول کو مقصدی نہیں کہا جا سکتا۔ مرزا ہادی رسوا کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے موضوع، تکنیک اور فکر و فن کے برتاو میں اس توازن کا استعمال کیا جس کی وجہ سے شہکار تیار ہوتے ہیں۔ کہنے کو یہ کہانی ایک طوائف کی زندگی سے متعلق ہے، اُسی طرح قصہ کا ماحول بھی اودھ سے تعلق رکھتا ہے لیکن ناول نگار کا نظریۂ کائنات وسیع اور بالیدہ ہے۔ اردو میں یہ پہلا موقع تھا جب ناول

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

نگار اس بات کو ٹھیک طریقے سے سمجھ رہا تھا کہ ناول میں پس منظر کا کتنا کام ہے۔ سرشار تہذیب و ثقافت کی جلوہ سامانیاں لُٹانے میں انتخاب اور قطع و برید کے فن سے دور ہو جاتے ہیں۔ مرزا رسوا کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے ایک تراشے ہوئے ہیرے کی طرح اپنا ناول تیار کیا۔ کوئی جُز حد سے بڑھا ہوا نہیں۔ نہ غم کی آنچ بہت تیز ہے اور نہ تفریح کی لے پنچم تک پہنچتی ہے۔ خود کلامی ہو یا مکالمہ؛ سماج کی کراہتوں کا بیان ہو یا عہدِ گذشتہ کے کبھی دل کش اور کبھی غم انگیز نظارے، کوئی ایسا مرحلہ نہیں ہے جہاں مرزا رسوا نے ایجاز و اختصار اور فنی پختہ کامی کا ثبوت نہیں دیا ہو۔ میر امن، غالب اور سر سیّد نے اردو نثر میں جدّت پسندی کی جو شمعیں مختلف اوقات میں جلائی تھیں، اُس کے بعد فکشن میں ایک ایسے ہُنر ور کی ضرورت تھی جو تمام نئے تصوّرات کو اپنی تخلیق میں ڈھال دے۔ مرزا رسوا نے ''امراؤ جان ادا'' لکھ کر اردو ناول کی تاریخ میں پہلا سنگِ میل قائم کیا۔

ناول کے فن اور تکنیک کے اعتبار سے مرزا رسوا نے جس عہدِ جدید کا خاکہ کھینچا، اس کا نقطۂ عروج پریم چند کے ناولوں میں سامنے آتا ہے۔ ''امراؤ جان ادا'' کے فوراً بعد پریم چند نے ناول نگاری شروع کی۔ ''اسرارِ معابد'' سے ''منگل سوتر'' تک پریم چند کے پندرہ ناول ہیں۔ اس تعداد میں ''گئودان'' اور ''میدانِ عمل'' جیسے شہکار بھی شامل ہیں۔ پریم چند کو ہندستان کی قومی تحریک کا وہ پس منظر ملا جس کے سہارے انھوں نے اپنے ناولوں کو اپنے عہد کا نبض پیما بنایا۔ سرشار اور رسوا سے پریم چند ان معنوں میں مختلف ہیں کہ انھوں نے بدلتے ہوئے سماج کے انتشار اور اضطراب کو پہلی بار قصّہ گوئی کا موضوع بنایا۔ پریم چند سے پہلے ہندستانی سماج میں بنگلہ کے چند ناول نگار بالخصوص بنکم چندر چٹرجی نے ہندستان کے دیہی سماج کے مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا تھا۔ بنگلہ کے لکھنے والوں سے پریم چند اس معاملے میں بالکل الگ ہیں کہ ان کا نقطۂ نظر جاگیردارانہ تہذیب کو بدل دینے والا ہے۔ جبکہ ایک مدّت تک بنگلہ سماج بھدرلوک کے موہ جال سے نکل ہی نہیں پایا۔

پریم چند کے یہاں اردو ناول نہ صرف اپنی موضوعاتی اور فنّی تکمیل کی حدوں تک پہنچتا ہے بلکہ اب اردو ناول دوسری زبانوں کے شہکاروں کے مقابل رکھا جا سکتا ہے۔ ''نرملا''، ''چوگانِ ہستی''، ''میدانِ عمل''، ''بازارِ حسن'' اور ''گئودان'' جیسے ناولوں سے پریم چند نے اردو قصّہ گوئی کو وہ بلندی عطا کی جس کے مقابل پوری بیسویں صدی میں کوئی دوسرا لکھنے والا سامنے نہیں آ سکا۔ ایک ایسی نثر پریم چند کے یہاں قصّے کی زبان میں ڈھلتی ہے جس میں کوئی تصنّع اور بناوٹ نہیں اور تعلیم یافتہ سے لے کر عام لوگوں کے بیچ وہ زبان کام میں آ سکتی ہے۔ مظلوموں، پسماندہ افراد، جدّ و جہد میں شامل لوگ اور استحصال کا شکار بے بس کسان اور مزدور، عورتیں — ان طبقات کو پریم چند نے اپنے فکشن میں اس طرح جگہ دی کہ انھیں آزادی سے قبل کے مظلومین کا سچّا ہمدرد اور دکھی ہندستانیوں کا سب سے پسندیدہ مصنّف مانا گیا۔ دنیا کی تاریخ میں ایسے تھوڑے سے ادیب اور شاعر ہیں جنھیں اپنی قوم کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔

پریم چند کے بعد اور ترقّی پسند ناول نگاروں کے بیچ رومانیت کے لہجے کی بازیافت کا دور ہے۔ قاضی عبدالغفار اور مجنوں گورکھپوری اردو کے دو اہم رومانی ناول نگار ہیں۔ پریم چند کی زندگی میں ہی اُن سے مختلف انداز کے لکھنے والے ابھر کر سامنے آ چکے تھے۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی، فیاض علی اور شوکت تھانوی رومانیت کو ظرافت کی حدوں تک لے گئے۔ ان ناول نگاروں

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

کا نقطۂ نظر باغیانہ یا ترقّی پسندانہ بھی ہے۔ زندگی کی بدلتی قدروں پر ان لکھنے والوں نے توجّہ کی۔ ترقّی پسند ناول کی پشت پر پریم چند اور رومانی یا مزاحیہ لکھنے والے مصنّفین دونوں کے گہرے اثرات رہے لیکن یہ تجرباتی دور ہے۔ اس لیے اس دوران کوئی ایسا بڑا لکھنے والا سامنے نہیں آسکا جس کی وجہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ اردو ناول پریم چند سے آگے بڑھا۔

ترقی پسند ناول نگاروں میں سب سے پہلے سجّاد ظہیر کا واحد ناول ''لندن کی ایک رات'' 1937 میں شائع ہوا۔ تکنیک کے اعتبار سے ''لندن کی ایک رات'' واقعتاً اہم ناول ہے۔ اس ناول کے ذریعے سجّاد ظہیر نے پہلی مرتبہ اردو میں شعور کی رَو کی تکنیک کا استعمال کیا۔ ''گئودان'' نے موضوعاتی اعتبار سے ناول کی جو مکمّل دنیا قائم کی تھی، اس میں کوئی اضافہ نہیں۔ سجّاد ظہیر نے فکشن میں کچھ خاص زیادہ کام بھی نہیں کیا۔ اُن کی شہرت کا دار ومدار اصل میں اُن کی تنظیمی استعداد کی وجہ سے ہے۔ کرشن چندر اور عصمت چغتائی ترقّی پسندوں میں خاصے مقبول ناول نگار ہیں۔ ''شکست'' کرشن چندر کا سب سے اہم ناول تسلیم کیا جاتا ہے جس میں فنّی اور ترقّی پسندانہ فکر دونوں کا توازن ملتا ہے۔ کرشن چندر نے یہ ناول 1943 میں لکھا۔ بعد میں ''جب کھیت جاگے'' کی اشاعت عمل میں آئی۔ ''ایک گدھے کی سرگذشت'' سے ظرافتی ناولوں کا ایک علاحدہ منظرنامہ سامنے آیا لیکن فنّی اعتبار سے ''شکست'' کرشن چندر کی ادبی فتح ہے۔ عصمت چغتائی نے ضدّی ناولٹ سے ابتدا کی لیکن 1947 میں ''ٹیڑھی لکیر'' کی اشاعت نے اُنھیں اردو کے بڑے ناول نگاروں کی صف میں شامل کیا۔ ''ٹیڑھی لکیر'' نفسیاتی دروں بینی اور شخصیت کے پیچ وخم کو گہرائی سے سمجھنے کے معاملے میں اردو کا عظیم ناول ہے۔ اس کے بعد 'ایک قطرۂ خون' نام سے عصمت نے ایک ناول لکھا لیکن اُنھیں ادبی عظمت ''ٹیڑھی لکیر'' کی وجہ سے ملی۔ ''گئودان'' کے بعد 1947 تک جو تخلیقات سامنے آئیں، اُن میں ''ٹیڑھی لکیر'' سب سے بڑا ناول ہے۔ ابتدائی ناول ہونے کے باوجود عصمت، کرشن چندر کی طرح ہی اپنے قائم کردہ نشان سے پوری ادبی زندگی میں آگے نہیں بڑھ سکیں۔

ترقّی پسند تحریک کے زمانے میں عزیز احمد نے بڑی تعداد میں ناول لکھے۔ 'ہوس'، 'مرمر اور خون'، 'گریز'، 'آگ'، 'ایسی بلندی ایسی پستی'، 'جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں' اور 'خدنگِ جستہ' عزیز احمد کے وہ کارنامے ہیں جن کی وجہ سے ایک نقّاد اور مفکّر کے ساتھ ساتھ وہ بہترین ناول نگار بھی ہیں۔ عزیز احمد، کرشن چندر یا دوسرے ترقّی پسندوں کی طرح سماجی حقیقت نگاری کو ناول کی بنیاد نہیں بناتے۔ نفسیاتی پیچ اور جنسی کج رویوں کا رشتہ عصری زندگی سے جوڑتے ہوئے عزیز احمد نے اردو ناول کی ایک بالغ نظر دنیا خلق کی۔ یوروپی ناولوں کا مطالعہ بھی ان کے کام آیا۔ جدید تعلیم یافتہ معاشرے کی اتھل پتھل کو بھی نہایت باریکی سے انھوں نے دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ احسن فاروقی کے مشہور ناول 'شامِ اودھ' کو اس وجہ سے ایک اہم کارنامہ تصور کیا جاتا ہے کیوں کہ تہذیبی مطالعات کا نیا زمانہ اُن کے ناول میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

1947 کے آس پاس بڑی تعداد میں ایسے ناول لکھے گئے جن میں ہندستان کی قومی تحریک سے ابھرنے والے مسائل اور تقسیمِ ملک کے اثرات زیرِ بحث آئے تھے۔ آزادی ملنے سے پہلے سے ہی ایک طبقے کے ذہن میں خوابوں کے بکھرنے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ترقّی پسند ناول نگاروں میں ایسے لوگ زیادہ تھے جنھیں فیضؔ کی زبان میں یہ کہنے کا موقع ملا کہ ''یہ داغ داغ اجالا،

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

یہ شب گزیدہ سحر'' یا'' چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی''۔ ابراہیم جلیس کے دو مشہور ناول ''چور بازار'' اور'' چالیس کروڑ بھکاری'' نئے ملک کی تعمیر کی رکاوٹوں کو افشا کرتے ہیں۔ اُس عہد میں شوکت تھانوی نے بھی خاصی تعداد میں ظریفانہ ناول لکھے۔ ان سب میں کہیں نہ کہیں بدلتے ہوئے حالات سے بے اطمینانی اور اپنی تمناؤں کے ٹوٹ کر بکھرنے کی کیفیات بھی شامل ہیں جن سے بعض تحریروں کی معنویت بڑھ جاتی ہے رقم کی گئی ہیں۔ سماجی مسئلوں کو اس سے پہلے نیم ظریفانہ انداز میں مرزا عظیم بیگ چغتائی نے بھی اپنے ناولوں 'خانم' اور 'چمکی' میں پیش کیا تھا۔ ترقی پسند ناولوں کا روشن خیالی کو قدر حیات بنانے کا یہ سلسلہ تھا جس کی ظرافت نگاری کے حوالے سے صنف ناول میں ابراہیم جلیس، شوکت تھانوی اور مرزا عظیم بیگ چغتائی ترجمانی کر رہے تھے۔

آزادی اور تقسیم ملک کا ایک بڑا المیہ فرقہ وارانہ فسادات ثابت ہوئے۔ اردو کے معروف اہل قلم اس میں سرگرمی سے اپنے انسانی نقطۂ نظر کو واضح کرتے ہوئے پائے گئے۔ کرشن چندر کا ناول ''غدار''، رامانند ساگر کا ناول ''اور انسان مرگیا''، قدرت اللہ شہاب کا ناولٹ ''یا خدا''، ایم اسلم کا ''رقص بسمل'' اور رشید اختر کا ''1947'' ایسے فن پارے ہیں جنھیں فسادات کے انسانیت سوز مسئلوں کو اپنے صفحات پر اتارنے کے لیے گہرائی سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ تمام تحریریں 48-1947 کے دوران شائع ہوئیں۔ وہ زمانہ برصغیر کے لیے امتحان کا تھا۔ مذہب اور جغرافیائی حد بندیوں کو بنیاد بنا کر جو انسانیت سوز اور ہیبت ناک واقعات رونما ہوئے، وہ ہندستانی تاریخ کے سیاہ اوراق ہیں۔ اتفاق سے اُس ابتدائی دور میں ناول نگاروں نے جذباتی سطح پر جیسی سرگرمی دکھائی، اُس کے مقابلے فکری بالیدگی کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ جذباتیت کی وجہ سے ہی مذکورہ تمام ناول کامیاب ثابت نہیں ہو سکے۔ کبھی اردو کے اہم ناولوں کی فہرست میں انھیں شامل نہیں کیا جا سکا۔ البتہ اُن کی تاریخی حیثیت قائم رہتی ہے۔

آزادی کے بعد اُس نسل نے ابتدائی دو دہائی میں سب سے زیادہ ناول لکھے جس کی پرورش و پرداخت ترقی پسند تحریک کے ماحول میں ہوئی تھی۔ اس دوران قرۃ العین حیدر اور عبداللہ حسین بڑے ناول نگار کے طور پر ابھر کر سامنے آئے۔ قرۃ العین حیدر کے ناولوں سفینۂ غم دل، میرے بھی صنم خانے، آگ کا دریا، آخر شب کے ہم سفر، کار جہاں دراز ہے، چاندنی بیگم اور گردشِ رنگِ چمن ایسا علمی اور تکنیکی طلسم ہیں جن کی وجہ سے قرۃ العین حیدر کو اردو ناول کی تاریخ میں ایک انوکھا اور مکمل باب تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ کہنا آسان ہے کہ قرۃ العین حیدر نے تاریخ اور تہذیب کو موضوع بنایا اور ''شعور کی رو'' تکنیک کو اپنایا۔ ناول نگار کی حیثیت سے قرۃ العین حیدر کا یہ ظاہری جہانِ معنی ہے۔ جس طرح پریم چند نے اپنے عہد میں ناول نگاری کا چہرہ بدل دیا تھا، بلا شبہ قرۃ العین حیدر نے اردو ناول کی ایک نئی کائنات خلق کی۔ اگر اُن کے ناولوں میں تاریخ ہے تو وہ تاریخ کی شکل میں نہیں ہے۔ تہذیب و ثقافت کے مضمرات داخلِ دفتر ہیں تو انھیں آپ تہذیبی تاریخ سمجھنے کی بھول نہ کریں۔ ایک بہترین تخلیقی فن کار کی حیثیت سے قرۃ العین حیدر کا یہ بہترین کارنامہ ہے کہ انھوں نے ہزاروں غیر افسانوی عناصر کو اپنی ناول نگاری کے توسط سے اردو ادب میں اس طرح داخل کیا کہ اُن کے بعد اسے قرۃ العین حیدر کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

''آگ کا دریا'' ناول کے بعد اگلے پندرہ برسوں تک اردو میں بہترین ناول ایک کے بعد ایک آتے گئے۔ ''اداس نسلیں'' (عبداللہ حسین) 'خدا کی بستی' (شوکت صدیقی)، 'علی پور کا ایلی' (ممتاز مفتی)، 'آنگن' (خدیجہ مستور)

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

'تلاشِ بہاراں' (جمیلہ ہاشمی)، 'ایک چادر میلی سی' (راجندر سنگھ بیدی)، 'لہو کے پھول' (حیات اللہ انصاری) 'بہت دیر کردی'، (علیم مسرور)——اردو ناول کی تاریخ میں سب سے طاقت ور نسل کے طور پر انھیں شمار کیا جاتا ہے۔ ان میں سے اکثر ناول نگاروں نے کئی دوسرے ناول بھی لکھے۔ ہندستان کی تحریکِ آزادی، مجاہدین کی قربانیاں، نئے ملک کی تعمیر کا خواب، فرقہ وارانہ فسادات، ناامیدی میں مقامی سطح پر جدّ وجہد کی تحریکیں اور آزادی کے بعد داخلی سطح پر باشندوں کا بکھراو، مختلف اوقات میں سیاسی کش مکش اور اختلافات میں شدّت جیسے موضوعات نے مذکورہ ناول نگاروں کی تحریروں کو ایک زندۂ جاوید پس منظر عطا کیا۔ اسی بنیاد پر اردو ناولوں کا سب سے زرخیز دور سامنے آیا۔ اس نسل کے فن کاروں نے بعد میں جو چند اہم ناول لکھے، اُن میں ''نادار لوگ''، ''نشیب''، ''ندی'' (عبداللہ حسین) ''جانگلوس'' (شوکت صدیقی)، ''زمین'' (خدیجہ مستور)، ''دشت سوز''، آبلہ پا (جمیلہ ہاشمی)، ''مدار'' (حیات اللہ انصاری) اہم ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے بعد عبداللہ حسین کو ناول نگار کی حیثیت سے امتیاز حاصل ہوا۔ ''اداس نسلیں'' کو عام طور پر اردو کے تین بڑے ناولوں (گئودان، آگ کا دریا اور اداس نسلیں) میں شمار کیا جاتا ہے۔ جس زمانے میں قرۃ العین حیدر تاریخ اور تہذیب کے پروں پر اپنے ناولوں کے صفحات سجا رہی تھیں، اُسی عہد میں عبداللہ حسین سماجی حقائق اور جذبوں کی تخلیقی دنیا کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ''اداس نسلیں'' اسی رفتہ رفتہ جدید ہندستان کا نوحہ بنا جس طرح غلام ملک میں گئودان کو اہمیت حاصل ہوئی تھی۔ اپنے عنوان کے سوز کو عبداللہ حسین نے اس ناول میں تقسیم ملک کے احوال رقم کرتے ہوئے کمال تک پہنچا دیا ہے۔

عبداللہ حسین کا دوسرا بڑا ناول ''نادار لوگ'' تقریباً تیس برسوں کے بعد شائع ہوا۔ اداس نسلیں جیسی ضخامت کے باوجود یہ ناول اہلِ اردو کے دلوں میں جگہ نہیں بنا سکا۔ پاکستان میں کئی کئی اشاعتیں ہوئیں لیکن اداس نسلیں نے جو معیار قائم کیا تھا، اس کے بعد جو دوسرے ناول لکھے گئے، ان میں خدیجہ مستور کا شہکار '' آنگن'' بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے پہلے کسی خاتون نے مکمل سیاسی ناول نہیں لکھا۔ آنگن میں مصنفہ نے ہمارے گھروں کے درمیان ملک کی تمام سیاسی سرگرمیوں کو قید کر کے بہترین تجربہ کیا۔ انسان کو جذبوں کی باریک سطح پر کیسے پہچانا جائے، اس کا جو دل پذیر انداز خدیجہ مستور نے پہچانا ہے، وہ ان سے مخصوص ہے۔ اسی وجہ سے اس ناول کا شمار ان کتابوں میں ہوتا ہے جنھیں لوگ بار بار اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں پڑھتے ہیں۔

''آگ کا دریا'' کی اشاعت سے 'لہو کے پھول' تک جس طرح اردو ناولوں کا سب سے زرخیز زمانہ سامنے آیا۔ اسی طرح ایک وقفے کے بعد ناول نگاری میں سرگرمی کا زمانہ 1988 میں عبدالصمد کے ناول ''دوگز زمین'' کی اشاعت سے شروع ہوتا ہے۔ تقریباً ۱۸ برسوں میں ناول نگاری کے منچ پر سناٹا چھایا رہا اور اس سنّاٹے کو توڑتے ہوئے 1988 میں ''دوگز زمین'' اور 1989 میں ''پانی'' (غضنفر) اور مکان (پیغام آفاقی) منظرِ عام پر آئے۔ تینوں ناولوں پر گفتگو تقریباً ایک ساتھ شروع ہوئی۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ گذشتہ ۱۵ برسوں میں پچاس سے زیادہ ناول لکھے جا چکے ہیں۔ عبدالصمد نے ''دوگز زمین'' جیسا ناول پیش کیا۔ ''دوگز زمین'' اور ''خوابوں کا سویرا'' ناولوں کے بعد عبدالصمد کے موضوعات کی حدود واضح ہونے لگی تھیں۔ لیکن ''مہاتما''

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

اور ''دھمک'' سے انھوں نے سماجی مسائل کے نئے ابعاد تلاش کیے۔ عبدالصمد زبان کے استعمال میں فن کارانہ سحر طرازی کے گر سے ابھی تک واقف نہیں ہو سکے ہیں۔ اس کے باوجود گذشتہ دو دہائیوں میں جو ناول سامنے آئے ان میں ''دوگز زمین'' سے بہتر اور مکمّل کوئی تخلیقی کارنامہ سامنے نہیں آیا۔

ہم عصر ناول نگاروں میں غضنفر نے سب سے زیادہ ناول لکھے۔ پندرہ برسوں میں اُن کے سات ناول سامنے آئے ـــــ 'پانی'، 'کینچلی'، 'کہانی انکل'، 'مم'، 'دِویہ بانی'، 'فسوں' اور 'وِش منتھن' سب مختصر ناول ہیں۔ زبان کی سطح پر غضنفر کے یہاں اچھی خاصی تجربہ پسندی ہے۔ ایک ناول سے دوسرے ناول پہنچتے ہوئے اُن کی موضوعاتی دنیا بھی بدل جاتی ہے۔ تکنیک کے اعتبار سے وہ نئے نئے تجربے کرتے ہیں لیکن اب تک اُن کے یہاں کوئی ایسا بڑا تخلیقی شہہ پارہ وجود میں نہیں آسکا ہے جسے بڑے ناولوں کی صف میں رکھا جاسکے۔ مشرّف عالم ذوقی نے بھی خاصی تعداد میں ناول لکھے۔ 'نیلام گھر'، 'بیان' 'مسلمان' اور 'پوکے مان کی دنیا' ناول قابلِ ذکر ہیں۔ اپنے صحافتی انداز کی وجہ سے ذوقی ناقدین کے درمیان قابلِ قبول نہیں بن سکے ہیں۔ پیغام آفاقی نے ایک ناول 'مکان' لکھ کر جو شہرت حاصل کی، وہ بہت کم لکھنے والوں کے حصّے میں آتی ہے۔ جدید شہری نظام کے مسئلوں پر اردو میں زیادہ ناول نہیں لکھے گئے۔ پیغام آفاقی نے اس موضوع کو بنیاد بنا کر ایک یادگار ناول لکھا۔

سیّد محمد اشرف نے 'نمبر دار کا نیلا'، انور خاں نے 'یاد بسیرے' اور 'پھول جیسے لوگ' لکھ کر اس روایت کو قائم رکھا جس میں اکثر افسانہ نگار ناولوں کی طرف بھی آتے ہیں۔ حسین الحق نے 'بولو مت چپ رہو'، 'فرات'، شفق نے 'کانچ کا بازی گر'، 'بادل' اور 'کابوس'، شموئل احمد نے 'ندی' اور 'مہاماری' جیسے ناول لکھے۔ صلاح الدین پرویز کا 'نمرتا'، 'ایک دن بیت گیا'، 'سارے دن کا تھکا ہوا پُرش'، 'آئڈنٹٹی کارڈ' اور 'دی وار جرنل' شائع ہوئے۔ پرویز کے فن پر باتیں کم ہوئیں اور دوسری وجوہات سے تنازعات زیادہ ہوئے۔ اُن کے یہاں اظہار میں جو شاعرانہ جھکاو ہے، وہ خاصے کی چیز ہے لیکن مکمّل تخلیقی شہہ پارہ بنانے میں وہ اب تک کامیاب نہیں ہو سکے۔ عشرت ظفر کا 'آخری درویش' مظہر الزماں خاں کا 'آخری داستان گو' بھی اسی دوران شائع ہوئے۔ بزرگوں میں اقبال مجید نے 'کسی دن' اور 'نمک' ناول شائع کیے۔ الیاس احمد گدّی کا ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ ناول 'فائر ایریا' 1980 کے بعد کے ناولوں میں بعض حلقوں میں بہترین ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔ شمس الرحمان فاروقی کا ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' اٹھارویں اور انیسویں صدی کو سامنے رکھ کر تہذیبی اور ثقافتی گوشوارہ تیار کرنے کی عالمانہ کوشش ہے۔ اب اگر یہ بہترین تخلیقی شہہ پارہ تسلیم کر لیا جائے تو ناول کی حیثیت سے اسے یادگار کہا جاسکتا ہے۔

اردو ناول کی تاریخ پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ ناول کا سفر خطِ مستقیم کی طرح ہموار نہیں ہے۔ کئی بار اچھے خاصے وقفے تک سناٹا چھایا رہا اور کئی بار تھوڑے سے وقفے میں کئی اہم ناول سامنے آئے۔ کسی کسی زمانے میں ناول نگاروں کی بھیڑ پیدا ہوگئی اور کبھی چند لکھنے والوں پر ناول کا قافلہ منحصر رہا۔ نذیر احمد سے لے کر موجودہ زمانے تک ناول نگاری کی سمت و رفتار، اِسی سلسلہ سے جوڑ کر دیکھی جاسکتی ہے۔ ابتدائی زمانے میں نذیر احمد سے مرزا رسوا تک ناول نگاروں کی یلغار ہے۔ بیسویں صدی میں ترقّی پسند تحریک سے پہلے پریم چند کے علاوہ کوئی بڑا ناول نگار اس عہد میں دکھائی نہیں دیتا۔ ترقّی پسندوں نے بھی

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
© Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

ناول نگاری کے باب میں اپنے بڑے کام تحریک کے عہدِ شباب میں نہیں انجام دیے بلکہ اُن کے ہاں ناول نگاری کا زرّیں عہد 1959-60 کے بعد شروع ہوتا ہے۔ 1970 کے بعد تقریباً دو دہائی تک ایک سنّاٹا رہتا ہے لیکن پھر ''دوگز زمین'' کی اشاعت نے ناول کو مرکزی صنف بنا دیا۔ شاید ہم عصر ناول نگار اردو ناول کے لیے کوئی دوسرا عہدِ زرّیں تیار کر رہے ہوں۔

ناول کے طالب علم کے لیے یہ ایک ضروری سوال ہے کہ اردو میں جو ناول کا سرمایہ ہے، اس کا معیار دوسری اصناف اور خود دوسری زبانوں کے ناولوں کے تناظر میں طے کیا جائے۔ جب دنیا کے مشہور ناولوں کی صف بن رہی ہوتی ہے، اُس وقت ہمارے پاس بڑی تعداد نہیں ہوتی۔ عام طور پر 'گئودان' (پریم چند)، 'آگ کا دریا' (قرۃ العین حیدر) اور 'اداس نسلیں' (عبداللہ حسین) ناولوں کو صفِ اوّل میں جگہ دی جاتی ہے۔ یہ تینوں ناول نگار اردو ادب میں اُسی طرح ممتاز ہیں جیسے دنیا کے ناول نگاروں کی صف بندی میں لیوٹالسٹائے، دوستوئیفسکی، جیمس جوائس، تھامس ہارڈی، جین آسٹن، ڈی-ایچ-لارنس، جارج آرویل وغیرہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اردو کے مذکورہ تینوں ناول اگر شہکار ہیں تو اس کی وجہ اُن کا نظریۂ کائنات ہے۔ ناول کو جب معاشرتی دنیا کا رزمیہ کہتے ہیں تو اُس کی عظمت کے تعیّن میں بھی وسعت اور ہمہ گیری کو بنیادی اہمیت حاصل ہوگی۔ 'گئودان'، 'آگ کا دریا'، اور 'اداس نسلیں' عظیم ناول اس لیے بھی ہیں کہ ان میں ہندستانی سماج اپنی گہرائی اور ہمہ رنگی اور دستاویزی ثبوتوں کے ساتھ موجود ہے۔ ان ناولوں میں واقعات کی کھتونی نہیں۔ ناول نگاروں کو معلوم ہے کہ تاریخ، تہذیب یا ملک ناول کا پس منظر ہیں۔ اسٹیج پر جو قصہ چل رہا ہے، وہ ہم عصر انسانی شبیہوں سے مکمل ہو رہا ہے۔ لیکن پس منظر سے رہ رہ کر جو ایک کرن ابھرتی ہے تو ناول کا قصہ ہزار رنگوں سے بھر جاتا ہے۔

موجودہ دور میں ناول نگاری کے لیے موافق حالات پیدا ہوئے۔ سائنس اور تکنیک کی برق رفتاری نے زندگی کی رفتار بڑھا دی ہے۔ 'دوگز زمین' سے لے کر 'روش منتھن' تک پانچ درجن سے زیادہ ناول اردو میں آئے جن کی نوعیتیں جدا جدا ہیں۔ معاشرتی مسائل سے لے کر طلسماتی دنیا تک اِن ناولوں میں زندگی کی واقعتاً ہمہ رنگ عکاسی ملتی ہے۔ عام طور سے ناول نگاروں سے یہ امید کی جاتی ہے کہ زندگی کی گہما گہمی اور بوقلمونی کو اپنی تخلیق کا لازمی حصّہ بنالیں۔ ہم عصر ناول نگاروں نے بلاشبہ اس میں کامیابی پائی ہے۔ تو پھر کوئی بڑا ناول کیوں نہیں سامنے آیا۔ ہوری، گوتم یا نعیم کی طرح بھرپور انسانی زندگیاں ہمارے ناولوں سے کیسے معدوم ہوگئیں۔ ہمارے پچھلے بڑے ناول اپنے عہد کا متبادل بن جاتے ہیں۔ کہتے ہیں 1936 سے پہلے کے ہندستان کی دیہی زندگی کی تاریخ جاننے کی خواہش ہو تو 'گئودان' پڑھ لیجیے۔ کیا 'دوگز زمین'، 'فسوں' یا 'فرات' پڑھ کر اس میں موجود عہد کا مکمل گوشوارہ دستیاب ہو سکتا ہے؟ غضنفر نے 'فسوں' میں ایک تعلیمی ادارے سے متعلق افراد کے زوال کو قلم بند کرنا چاہا لیکن کیا ہوری کی طرح وہ انسانی سوز سے لبالب کسی کردار کو خلق کرنے میں کامیاب ہو سکے؟ نہیں۔ الیاس احمد گدی نے کویلری کی زندگی اور سیاست کو موضوع بنایا لیکن ایسا لگتا ہے کہ 'فائر ایریا' ابتدائی صفحات کے بعد تخلیقی توانائی سے محروم ہو جاتا ہے۔ بقیہ صفحات محض قصے کی تکمیل ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اردو ناول نگاروں کے درمیان کوئی ایسا شخص نہیں جس کا ذہن مشرق و مغرب کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے آنگن میں موجود روایت کے ایک ایک پہلو پر بھی نگاہ رکھتا ہو۔ ناول میں صرف زیادہ صفحات نہیں چاہیے بلکہ

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

زندگی کی وہ گہری اور سچی ترجمانی بھی لازمی ہے جس کے بغیر بڑا ادب نہیں لکھا جاسکتا۔ زندگی کی ہمہ گیر ترجمانی اور نقطۂ نظر کی ثقافتی اور گہرائی کے بغیر بڑا ناول نہیں لکھا جاسکتا۔ اس پر مستزاد یہ کہ لکھنے والے کو پتا ہونا چاہیے کہ وہ تاریخی واقعہ نہیں لکھ رہا بلکہ ایک فنی شہکار بھی تیار کر رہا ہے۔ ابھی اردو کے ادبی منظر نامے پر ناول نگاروں کی بھیڑ تو ہے لیکن اُن میں سے کوئی عظیم یا لافانی ناول عطا کر پائے گا، اِس پر یقین نہیں ہوتا۔

مختصر گفتگو

۱۔ اردو ناول کن اسباب سے وجود میں آیا؟

۲۔ درج ذیل ناولوں کے مصنفین کے نام لکھیے :

ابن الوقت، صورۃ الخیال، مجالس النسا، اصلاح النسا، فسانۂ آزاد، حاجی بغلول۔

۳۔ پریم چند کے پانچ اہم ناولوں کے نام لکھیے۔

۴۔ قرۃ العین حیدر کے چھے ناولوں کے نام تحریر کیجیے۔

۵۔ ناول 'مکان' کا موضوع کیا ہے؟

۶۔ تین ویسے افسانہ نگاروں کے نام لکھیے جنھوں نے ناول نگاری کی طرف توجہ کی؟ ان مصنفین کے دو دو ناولوں کے نام بھی لکھیں۔

۷۔ اردو کے تین سب سے اہم ناولوں اور ان کے مصنفین کے نام لکھیے۔

تفصیلی گفتگو

۱۔ 'امراؤ جان ادا' سے قبل لکھے گئے ناولوں کا جائزہ لیجیے۔

۲۔ ''امراؤ جان ادا اردو ناول کی تاریخ میں سنگِ میل ہے۔'' اس قول کا ناقدانہ جائزہ لیجیے۔

۳۔ ''اردو ناولوں میں ظرافت'' ـــــ اس عنوان پر ایک مختصر مضمون لکھیں۔

۴۔ پریم چند کی ناول نگاری پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

۵۔ ترقی پسند ناول نگاری کی خصوصیات واضح کریں۔

۶۔ قرۃ العین حیدر کے ناول سابقین کی تحریروں سے علاحدہ انداز کے حامل ہیں۔ کیسے؟

۷۔ دورِ حاضر کے ناولوں کا جائزہ لیجیے۔

۸۔ آج عظیم ناول کیوں نہیں لکھے جا رہے ہیں؟ اسباب بتائیے۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

مختصر افسانہ

مختصر افسانے کو زندگی کی ایک قاش کہا گیا ہے۔ طول طویل انسانی زندگی کے کسی خاص موڑ یا مخصوص واقعے کو تخلیق کار اپنی فکر کا حصّہ بناتا ہے۔ زندگی شرح وبسط کے ساتھ مختصر افسانوں میں جگہ نہیں پاتی بلکہ ایک اجمالی تاثر کار فرما ہوتا ہے۔ مغرب سے جن اصناف کو اہلِ اردو نے لاکر پھلنے پھولنے کا موقع دیا، اُس میں مختصر افسانے کی سب سے زیادہ ترقّی ہوئی۔ اس صنف کو بڑی تعداد میں لکھنے والے ملے اور مقبولیت کے اعتبار سے اِسے اور زیادہ اعتبار حاصل ہوا۔ جتنی کم عمر اس صنف کی ہے، اُس کے مقابلے میں اس کا سرمایہ، معیار اور مقدار دونوں اعتبار سے وزنی تسلیم کیا جائے گا۔

فکشن کی دوسری اصناف کی طرح مختصر افسانے میں بھی قصہ گوئی ایک لازمی عنصر ہے۔ داستان اور ناول کی طرح یہاں افسانہ نگار قصّہ گوئی کے آداب استعمال میں لائے تو افسانہ بگڑ جائے گا۔ مختصر افسانے کے فن کا یہ تقاضا ہے کہ قصّے کو اجمال میں رہنے دیا جائے۔ اُس کے واقعات اور کردار ناول اور داستانوں کی طرح آزادی کے ساتھ اپنا رخ نہیں موڑیں۔ افسانے میں لکھنے والے کا دھیان صرف اُسی قصّے پر ہوتا ہے جسے اُس نے مرکزیت عطا کی۔ ضمنی قصوں اور قصّے کے درمیان سے قصّہ نکلنے کے لیے یہاں کوئی مہلت نہیں ہے۔ اِسی لیے مختصر افسانے میں سب سے گٹھا ہوا پلاٹ موجود ہوتا ہے۔ بعض نقاد غزل کے اشعار سے افسانے کو جوڑتے ہیں کہ چول سے چول بٹھانا، فن کار کا فریضہ ہے۔ جب قصّے پر اتنی سختی ہو، اُس وقت کرداروں کے تعلّق سے بھی زیادہ آزادی میسّر نہیں آئے گی۔ افسانہ نگار اگر چاہے تب بھی مکالمات کی رنگ برنگی دنیا نہیں سجا سکتا۔ ایسا نہیں ہے کہ افسانہ نگار کے پاس زندگی کا کوئی واضح تصوّر موجود نہیں لیکن ناول کی طرح اُسے آزادی نہیں ملی ہے۔ اُسے اپنے تاثرات، مشاہدات، افکار اور نظریات سب بس اشاروں میں نہایت اختصار کے ساتھ پیش کرنا ہوتا ہے۔ اتنی قید و بند میں فکشن کا جو کارنامہ تیار ہوتا ہے، اُسے مختصر افسانہ کہتے ہیں اور اِسی لیے بعض نقادوں نے یہ اعلان کیا کہ مختصر افسانہ چاول پر 'قُلْ ھُوَاللّٰہ' لکھنے کا فن ہے۔

فنّی اعتبار سے مختصر افسانے میں ڈرامے کی طرح نقطۂ عروج کی بڑی اہمیت ہے۔ ناول یا داستان کسی خاص موڑ پر بہت چونکا دے، یہ ضروری نہیں۔ لیکن افسانے میں چونکانے کی کیفیت یا کسی مخصوص موڑ پر ختمِ سفر کا اعلان لازمی شے ہے۔ اشارہ غزل کی طرح افسانے کا وصفِ خاص ہے۔ افسانے کے اختصار سے یہ سمجھنا کہ ناول کے مقابلے اس کی دنیا اور زندگی محدود ہے، صحیح نہیں ہے۔ مصوّری کا نمونہ ایک ہتھیلی کے برابر جگہ پر ہو یا سو فٹ لمبائی کا کینوس ہو، اس کے معیار کا تعیّن طوالت یا اختصار سے متعیّن ہوگا؟ تاج محل کا حسن اور ایک گلاب کی خوب صورتی دونوں کے مقابلے میں رقبہ کو بنیادی اہمیت حاصل نہیں ہو سکتی۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime

Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

اِسی لیے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ ناول کے مقابلے زندگی کی ترجمانی کا فن مختصر افسانہ ہے۔ کئی مختصر افسانے ہیں جنھیں پھیلا کر ناول یا پوری فیچر فلم بنانے میں فن کاروں نے کامیابی پائی اور کئی ایسے ناول ہیں جنھیں ماہرین نے مختصر کر کے پیش کر دیا۔ اس کے باوجود مختصر افسانے کی قوت سے انحراف نہیں کیا جا سکتا۔ تاثر کے اعتبار سے تو یہ صنف بے مثال ہے کیوں کہ کبھی چند صفحات کا کوئی افسانہ طول طویل ناولوں کے مقابلے زیادہ یاد کیا جاتا ہے۔ پریم چند کے افسانے ''عیدگاہ''، ''دو بیل''، ''کفن''، منٹو کے ''کالی شلوار''، ''کھول دو'' یا بیدی کی تخلیق ''لاجونتی'' ــــــ سب بہت مختصر ہیں۔ لیکن اردو افسانے کی تاریخ میں اِن افسانوں پر نہ جانے کتنے صفحات صرف ہوئے ہیں۔

اردو میں افسانے کی تاریخ زیادہ پُرانی نہیں۔ اردو کے اوّلین لکھنے والوں میں ابتدائی تین مصنّفین کا ذکر ہوتا ہے۔ سجّاد حیدر یلدرم، پریم چند اور علی محمود ــــ اردو کے اوّلین تین افسانہ نگار ہیں۔ ایک زمانے تک پریم چند کے افسانے ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' کو اردو کا پہلا افسانہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ عام طور سے یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ یہ افسانہ 1907 میں رسالہ ''زمانہ'' میں شائع ہوا۔ یہ اطلاع خود پریم چند نے اپنے بارے میں لکھتے ہوئے دی تھی۔ بعد میں 'مانک ٹالا' نے اپنی تحقیق سے بتایا کہ زمانہ میں 1907 میں پریم چند کا کوئی افسانہ شائع نہیں ہوا۔ ایک عرصے تک 1900 میں رسالہ ''معارف'' علی گڑھ میں شائع سجّاد حیدر یلدرم کے افسانے ''نشے کی پہلی ترنگ'' کو پریم چند سے پہلے کا افسانہ اور اردو کا پہلا افسانہ مانا گیا لیکن ایک مسئلہ یہاں بھی ہے کہ سجّاد حیدر یلدرم کے افسانوں میں اکثر و بیش تر ترکی سے اخذ شدہ یا ترجمہ ہیں۔ عام طور پر اب یہ مانا جانے لگا ہے کہ سجّاد حیدر یلدرم کا یہ افسانہ اردو کا پہلا افسانہ ہے۔ اُسی سال یلدرم کی تخلیق ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ'' بھی چھپی۔ جسے قرۃ العین حیدر اردو کا پہلا افسانہ تسلیم کرتی ہیں۔ یلدرم کے یہاں انشائی عناصر افسانے کی تعمیر میں حائل ہیں۔ 1904 کے رسالہ 'مخزن' کے جنوری اور اپریل کے شماروں میں علی محمود کے افسانے ''چھاؤں'' اور ''ایک پرانی دیوار'' شائع ہوئے۔ بعض ناقدین اِن تخلیقات کو اردو کے اوّلین طبع زاد افسانوں میں شمار کرتے ہیں حالاں کہ ان تحریروں میں مضمون اور انشائیے کا انداز موجود ہے۔ ظاہر ہے پریم چند 1904 میں کچھ بھی نہیں لکھ سکے تھے اور یلدرم کی ابتدائی تحریروں کو حتمی طور پر طبع زاد کہنا مشکل ہے۔ اس لیے انصاف کا تقاضا تو یہی ہے کہ علی محمود کو اردو کا پہلا افسانہ نگار قرار دیا جائے۔ بعد میں علی محمود کی تحریریں قابلِ اعتنا نہیں قرار دی گئیں۔ اس وجہ سے ان کی اوّلیت سے بھی صرفِ نظر ہوا۔ ادب کی تاریخ کے طالب علم کے طور پر یہ بات زیادہ قابلِ قبول معلوم ہوتی ہے کہ یلدرم، پریم چند اور علی محمود تینوں کو اردو افسانے کی عمارت قائم کرنے والوں میں مشترکہ اہمیت دی جائے۔

اردو کے ابتدائی افسانہ نگاروں میں اولاً سب سے زیادہ شہرت سجّاد حیدر یلدرم کی ہے۔ ''خیالستان'' کے افسانے اپنے پُر اثر اسلوب اور انشائیہ رنگ کی وجہ سے مقبول ہوئے۔ ابھی فکشن کی سب سے موزوں زبان کون سی ہو اور انشا پردازی کے مقابلے افسانوی ادب کے لیے کسی دوسری زبان یا انداز کا خاکہ اُس وقت تک تیار نہیں ہوا تھا۔ جس کے سبب انشا پردازی کی اہمیت زیادہ تھی اور نثر نگار، نثر کا بنیادی جوہر وضاحت اور صراحت کے مقابلے انشا پردازی کو تسلیم کیے بیٹھے تھے۔ سر سیّد کے اثرات نثر پر ضرور واضح تھے لیکن فکشن کی فطری زبان کی تلاش کا کام ابھی باقی تھا۔ بلاشبہ سجّاد حیدر یلدرم اس ذمے داری سے عہدہ برآ ہونے کے اہل

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

نہیں تھے۔ اس لیے بہترین انشا پرداز ہونے کے باوجود اُن کی نگارشات کو تاریخ ادب اردو میں اہم افسانوں کے طور پر کبھی شمار نہیں کیا جاسکتا۔ پریم چند کے اُبھرنے سے پہلے سجّاد حیدر کی ادبی شہرت قائم ہو چکی تھی اور تاریخ وار مطالعہ کریں تو یہ اندازہ ہوگا کہ سجّاد حیدر کے اثرات ہم عصر ادبی فضا پر زیادہ تھے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو رومانی دبستان کے لکھنے والے افسانہ نگاروں کی ایک مختصر فوج بھلا کیسے افسانے کی بزم میں آپاتی۔ نیاز فتح پوری کے افسانوں کا سلسلۂ نسب یقینی طور پر یلدرم سے ملتا ہے۔ یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ تھوڑے وقفے کے بعد مجنوں گورکھ پوری، میرزا ادیب، قاضی عبدالغفار، حجاب اسماعیل جیسے افسانہ نگار ابھرے جنھیں رومانی دبستان کا فن کار کہا جاسکتا ہے۔ اور جن کی پشت پر یلدرم کے واضح اثرات تھے۔ اس سچائی سے بھی انکار ممکن نہیں کہ یلدرم سے حجاب اسماعیل تک رومانی نثر نگاری اور انشا کی بنیاد پر افسانوں کو قائم کرنے کا جو تجربہ ہوا، وہ دائمی اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ اردو کے رومانی افسانوں کو تاریخی اعتبار سے ہم اہمیت دے سکتے ہیں لیکن پریم چند کی رہنمائی میں جو نیا فکشن تیار ہوا، اُس کے مقابلے رومانی دبستان کی اہمیت برائے نام ہے۔

اردو مختصر افسانے کی یہ خوش بختی ہے کہ بالکل ابتدائی زمانے میں ہی اُسے وہ فن کار میسّر آیا جو اُس صنف کا ایک صدی کے بعد بھی سب سے بڑا لکھنے والا ہے۔ پریم چند کی افسانہ نگاری کی کُل مدّت تیس برس سے کم ہے اور اردو ہندی میں تین سو سے زیادہ اُن کے افسانے شائع ہوئے۔ پریم چند کی اصل اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے اردو افسانے کو موزوں تکنیک، موزوں زبان اور حدود وار بعہ سے آشنا کرایا۔ اُن کے بعد یہ سب کو معلوم تھا کہ افسانہ نگاری کے اصول کیا ہیں، پلاٹ کا ماڈل کیا ہوگا اور مضمون کی زبان اور فکشن کی زبان میں کون سا بنیادی فرق ہے۔ افسانہ با مقصد ہوتے ہوئے بھی کیسے مضمون یا فلسفے سے علاحدہ ہے۔ پریم چند نے اپنی تخلیقات سے یہ واضح کر دیا کہ افسانہ نگاری کا آئندہ سفر کس طرح ہوگا اور کون سے راستے کی طرف بڑھنا مناسب ہوگا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ نثر کا وہ تصوّر پیش کیا جو اب سے پہلے کسی نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اس لیے پریم چند اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے اہم افسانہ نگار تو ہیں ہی، اُن کے اثرات ہمہ جہت اور دور رس رہے۔ یہ کہنا شاید بہت مشکل ہے کہ آج کا افسانہ پریم چند کے اثرات سے خالی ہے۔

1936 میں پریم چند کا انتقال اور ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑتی ہے۔ پریم چند کے بعد ترقی پسند افسانہ نگاروں کی ایک مستقل ٹیم ہمارے سامنے آتی ہے۔ ہندستان کے نئے ماحول اور بدلتی ہوئی صورتِ حال کے پیش نظر لکھنے والوں کی ایک ایسی جماعت سامنے آچکی ہے جس کا ایک سرا پریم چند سے ملتا ہے اور دوسرا سرا اس عہد کے عالمی ماحول اور جدید تعلیم سے جڑا ہوا ہے۔ 1932 میں ''انگارے'' کی اشاعت نے اردو افسانے کا ایک نیا مورچہ قائم کیا۔ سجّاد ظہیر کے تین ساتھیوں ـــــ احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر کی تحریریں اس مجموعے میں شامل ہیں۔ سجّاد ظہیر نے خود اپنے پانچ افسانے یہاں پیش کیے۔ نو افسانے اور ایک ڈرامے کی یہ کتاب قدامت اور جدّت کے دوراہے پر کھڑے ہندستانی سماج پر کاری ضرب ثابت ہوئی۔ نئے تعلیم یافتہ لوگوں سے دنیا کیسے بدل رہی ہے اور خاص طور سے عورت اور مرد کی زندگیوں میں کون سی تبدیلی ہو رہی ہے، اس کا بہترین اشاریہ یہ کتاب ہے۔ یہ غلط فہمی ہے کہ ہم سمجھتے رہیں کہ اس وقت ہندستانی سماج کا واحد موضوع جدّ وجہدِ آزادی ہے۔ غلامی سے

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

نجات چاہیے لیکن انسان کئی اور طرح کی غلامیوں میں بھی جکڑا ہوا تھا۔ چھوا چھوت بھی ایک غلامی تھی۔ اسی طرح عورت اور مرد کی غیر برابری بھی ایک غلامی تھی۔ 'انگارے' کے مصنّفین نے اس غلامی سے اپنے افسانے میں مقابلہ کرنا چاہا۔ نتیجہ صاف تھا، یہ کتاب ضبط کر لی گئی۔ نوجوان لکھنے والے بڑی مشکل سے مقدمہ جیت کر اپنی سماجی آبرو قائم رکھنے میں کامیاب ہوسکے۔ لیکن یہ مختصر سی کتاب اردو افسانے کا ایسا Turning Point ہے جہاں سے افسانے بدلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

1932-36 کے دوران پریم چند کی بعض ایسی کہانیاں بھی شائع ہوئیں جن میں پریم چند عورت اور مرد کے رشتے پر دوسرے انداز میں گفتگو کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بعض ناقدین کا اصرار ہے کہ پریم چند پر اپنے سے آدھی عمر کے نوجوان مصنّفین کا یہ واضح اثر ہے۔

پریم چند اور ''انگارے'' ترقّی پسند افسانہ نگاروں کے لیے دو روایتیں تھیں۔ 1936 کے بعد کے اردو افسانے پر دونوں دبستان اپنے واضح اثرات کے ساتھ ترقّی پسندی کی تعمیر وتشکیل کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ترقّی پسند افسانہ نگاروں کی سب سے طاقت ور نسل کی نمایندگی اُن چار لکھنے والوں نے کی جنھیں پریم چند کے بعد اردو افسانے کی سب سے معتبر آواز مانا گیا۔ منٹو، بیدی، کرشن چندر اور عصمت چغتائی اردو افسانے میں اپنی آزادانہ شناخت قائم کرتے ہیں۔ 1936 سے 1950 کے درمیان ان افسانہ نگاروں نے اردو افسانے کی وہ دنیا بدل دی جو پریم چند کی روایت سے قائم ہوئی تھی۔ اب ہندستان شہروں کی طرف بڑھ رہا تھا اور افسانے کا فن بھی زیادہ گہرائی کا مطالبہ کر رہا تھا۔ حقیقت نگاری کے تصورات بدل گئے تھے اور عصری زندگی نئے رنگ میں ڈھلنا چاہتی تھی۔ اِن چاروں لکھنے والوں کے ہاں افسانے کے فن اور موضوعات کے اعتبار سے زبردست پختگی اور فروغ دیکھنے کو ملتا ہے۔ کرشن چندر اپنے بہترین انشا اور ترقّی پسندانہ موضوعات کی ترسیل، سعادت حسن منٹو شفاف حقیقت نگاری، تحلیلِ نفسی اور افسانے کی موزوں ترین زبان کے سبب تاریخی اہمیت حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ راجندر سنگھ بیدی نے دروں بینی اور نفسیاتی اعتبار سے پیچ در پیچ مقاصدِ حیات پر نگاہ رکھی اور عصمت چغتائی نے مسلمان گھروں کی عورتوں کی زندگی کو موضوع بنا کر ایک انقلابی کارنامہ انجام دیا۔

اس دوران ترقّی پسند افسانہ نگاروں کی ایک پوری فوج سامنے آچکی تھی۔ احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ، دیوندر ستیارتھی، اپندر ناتھ اشک، سہیل عظیم آبادی، حیات اللہ انصاری، اختر اورینوی، اعظم کریوی، علی عبّاس حسینی جیسے افسانہ نگار بڑی تعداد میں بہترین افسانے لکھ رہے تھے۔ 1930-60 کے درمیان اردو کے افسانوی سرمایے پر غور کریں تو ایسا محسوس ہوگا کہ اس سے زیادہ بڑے افسانہ نگاروں اور بہترین افسانے لکھنے کا دور کبھی نہیں آیا۔ اردو کے لازوال افسانوں کی فہرست بنائیں تو اس میں سب سے زیادہ اسی دور کے افسانے شامل رہیں گے۔ اس اعتبار سے ترقّی پسند افسانوں کے اس دور کو اردو افسانے کا عہدِ زرّیں کہا جاسکتا ہے۔ اِس نسل کی ایک اور بڑی طاقت یہ ہے کہ فوری طور پر دوسری اور تیسری نسل سرگرمی کے ساتھ افسانے لکھتی رہی۔ قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، عبداللہ حسین، خدیجہ مستور، شوکت صدیقی، ممتاز مفتی، رتن سنگھ، جوگندر پال، غیاث احمد گدی، کلام حیدری، قدرت اللہ شہاب، ہاجرہ مسرور جیسے افسانہ نگار ترقّی پسند عہد کے دورِ دوم کی یادگار ہیں۔ اِن سب کی تخلیقی سرگرمیوں نے اردو فکشن بالخصوص افسانہ نگاری کو مقامِ استناد تک پہنچایا۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

آزادی کے فوراً بعد ملک میں جو قتل و غارت گری کا ماحول پیدا ہوا؛ اُس نے اردو ادب پر اپنے گہرے اثرات چھوڑے۔ ادب صالح انسانی اقدار کا ترجمان ہوتا ہے۔ فسادات اور خوں ریزی کے خلاف جو جنگی سطح پر مہم شروع ہوئی، اُس میں اردو کے افسانہ نگاروں نے اپنا خونِ جگر صرف کیا۔ قتل و خون کے خلاف یہ کسی زبان یا اُس کے ادب کی جانب سے صدائے احتجاج تھی۔ جدید ہندستانی ادب کے تاریخ نویس اس بات سے متفق ہیں کہ تقسیم ملک اور فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں جتنے کامیاب اور پُر اثر افسانے اردو میں لکھے گئے ہیں، شاید ہی کسی دوسری زبان میں ایسا ہوا ہو۔ کرشن چندر نے نہ صرف ''پشاور ایکسپریس'' جیسی فنّی اعتبار سے کامیاب کہانی لکھی بلکہ ''ہم وحشی ہیں'' عنوان سے ایسے افسانوں کا مکمّل انتخاب بھی شائع کر دیا۔ منٹو کے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اور ''موذیل'' افسانوں کو کون بھلا سکتا ہے۔ بیدی کی ''لاجونتی''، خواجہ احمد عباس کا ''میری موت''، قدرت اللہ شہاب کا ''یا خدا'' ایسے افسانے ہیں جن کے بغیر اردو افسانے کی تاریخ مکمّل نہیں ہوسکتی۔ آج ہندستان کے کسی گوشے میں کسی زبان میں فسادات کے المیوں کے سلسلے سے جب بھی چند افسانوں کی بات ہوگی، اردو اُس میں صفِ اوّل میں جگہ پائے گی۔

ترقّی پسند افسانوں کے بہترین دور کے بعد جدید افسانے کی باری آئی۔ غیاث احمد گدّی، سریندر پرکاش، انور سجّاد، بلراج مین را میں سے اکثر 1950 کے آس پاس افسانے لکھنے لگے تھے اور تھوڑی مدّت تک ترقّی پسند افسانہ نگار کے طور پر اُن کی پہچان بھی ہوئی لیکن 1950 کے بعد ترقّی پسندوں کے بیچ سے ایک نا مطمئن طبقہ ابھرنے لگا۔ قرۃ العین حیدر کو بھی اُس وقت ترقّی پسند اپنی محفل سے باہر کر رہے تھے۔ عصمت چغتائی نے کبھی ''پوم پوم ڈارلنگ'' لکھ کر قرۃ العین حیدر کو غیر ترقّی پسند ثابت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن سردار جعفری اور دوسرے ناقدین اور تنظیم کار، خود عصمت چغتائی میں زوال پسندی کے رنگ دیکھ رہے تھے۔ اس ماحول میں نئے لکھنے والے ترقّی پسندوں سے دور بھاگنے میں ہی عافیت محسوس کر سکتے تھے۔ دنیا کی سطح پر بھی شعر و ادب کے انداز بدل رہے تھے۔ اِسی مرحلے میں اردو کا نیا افسانہ خلق ہوتا ہے۔ ترقی پسند افسانوں سے نیا افسانہ ان معنوں میں پورے طور پر الگ ہے کہ یہاں صراحت کی جگہ اشارے، سادہ پلاٹ کی جگہ پُر پیچ پلاٹ، عوامی اور اجتماعی موضوعات کی جگہ انفرادی زندگی کے مسائل سے متعلّق مباحث بھی آزمائے جانے لگے۔ افسانے میں علامات اور استعارے کا دخل بڑھا۔ افسانے کی فضا تجریدی ہونے لگی۔ شفیع جاوید، احمد یوسف، احمد ہمیش، خالدہ حسین، کمار پاشی، بلراج کومل، حمید سہروردی، کلام حیدری، انور عظیم، الیاس احمد گدّی جیسے افسانہ نگار ترقّی پسند افسانے کے بعد نئے افسانے کے خال و خط سنوارنے میں سرگرم ہوئے۔

تھوڑے وقفے کے بعد 1970 کے آس پاس ایک اور نسل سامنے آئی جس میں سلام بن رزّاق، شوکت حیات، حسین الحق، ساجد رشید، طارق چھتاری، غضنفر، سیّد محمد اشرف، عبد الصمد، شفق، انور خاں، انور قمر، انجم عثمانی، نیر مسعود جیسے اہم افسانہ نگار سامنے آئے۔ جدید افسانے کی پہلی نسل کے مقابلے اُن کے یہاں صورت میں کچھ احتیاط پسندی تھی۔ خاص طور پر 1970 کے بعد کے افسانے الگ رنگ ڈھنگ کے تھے۔ جدید افسانہ نگاروں کی دونوں نسلوں کے مشترکہ سرمائے کو دھیان میں رکھیں تو یہ کہنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ اردو افسانہ ترقّی پسندوں کے بنائے نشانے سے آگے بڑھا۔ خاص طور پر منٹو، بیدی،

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

کرشن چندر اور عصمت چغتائی نے جو معیار اور قبولیت کے پیمانے وضع کیے تھے، اُن تک جدید افسانہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس بیچ علامت اور تجرید کی وجہ سے اردو کے رسائل میں شائع شدہ افسانے مقبولیت سے دور چلے گئے۔ کہتے ہیں، جدیدیت کے عہد میں فکشن سب سے نامقبول حوالہ بنا۔

1980 کے آس پاس اردو افسانے پر جدیدیت کا جبر کم ہوا۔ اس دوران کئی ایسے افسانہ نگار سامنے آئے جنھوں نے افسانے میں کہانی پن اور روایتی بیانیہ کی بازیافت کی۔ اس دور میں پھر سے افسانے میں قصّے پن کو اہمیت حاصل ہوئی اور افسانہ جو سمجھ میں آسکے اور آسانی سے قاری تک جس کی رسائی ہوسکے، اُس پر پھر سے یقین ہونے لگا۔ بعض ناقدینِ ادب 1980 کے بعد کے افسانے کو مابعد جدیدیت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مشرف عالم ذوقی، صغیر رحمانی، خورشید اکرم، قاسم خورشید، رحمان شاہی، شاہد اختر، اختر واصف، شموئل احمد، سہیل وحید، غزال ضیغم، تبسم فاطمہ، ترنم ریاض وغیرہ اس نسل میں متواتر افسانے لکھنے والے افراد ہیں۔ 1980 کے بعد جدید افسانہ نگاروں کی دونوں نسلوں نے اپنے بدلے ہوئے مزاج کے ساتھ افسانے پیش کیے۔ اس لیے 1960 کے زمانے کے اقبال مجید یا 1970 کے زمانے کے شوکت حیات کا 1980 کے بعد انداز بالکل بدل جاتا ہے۔ یہ کہنا چاہیے کہ 1980 کے بعد جدید افسانے کی مابعد جدید افسانہ نگاروں کی رہ نمائی میں کایا کلپ ہوتی ہے۔ موجودہ دور میں 1960، 1970، 1980، تینوں زمانے کے افسانہ نگار بے حد سرگرمی کے ساتھ افسانے لکھ رہے ہیں۔

سجاد حیدر یلدرم اور پریم چند کے عہد سے لے کر آج تک اردو افسانہ اپنے عہد کی سب سے مقبول نثری صنف کے طور پر قائم رہا۔ ایک صدی سے زیادہ گزرنے کے باوجود اس کی مقبولیت میں کچھ خاص کمی دیکھنے کو نہیں ملی۔ یہ غور کرنے کا مقام ہے کہ افسانے میں وہ کون سا جوہر تھا کہ ہر عہد میں یہاں تازگی اور تابندگی کے عناصر دیکھنے کو ملے۔ افسانے میں کئی ایسی باتیں دیکھنے کو ملیں جو دوسری صنفوں کے مقابلے زیادہ موثر انداز میں موجود تھیں۔ یہ سچائی ہے کہ ہم عصر فضا کو ان دیکھا کر کے کوئی ادبی تخلیق شہہ پارہ نہیں بن سکتی لیکن بدلتے وقت کے حرکات وسکنات اور آہٹوں کو سمجھ کر وقت سے پہلے خود کو بدل لینا دور اندیش اور آگے بڑھنے والے آدمی کا کام ہوتا ہے۔ غزل اور افسانے میں تبدیلیوں کو انگیز کرنے کی سب سے زیادہ صلاحیت رہی ہے۔ تکنیک کی سطح پر بھی بار بار بدلاؤ آئے۔ افسانوں کو یہ فائدہ ہوا کہ ایک وقت میں کئی دھارے موجود تھے۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ گانو کی کہانیاں سب لکھ رہے تھے یا علامتوں کو اردو کے تمام افسانہ نگاروں نے اپنا تاج بنالیا تھا یا عورت اور مرد کے تعلقات پر ہی سارے افسانہ نگار مشق فرما رہے تھے۔ اس لیے اگر پریم چند ہیں تو اُن کے عہد میں یلدرم کی انشاپردازی بھی ہے اور انگارے کا باغیانہ روّیہ بھی۔ جب علامتوں کا زور بڑھا، اس عہد میں بھی ٹھیٹھ گانو کی کہانیاں لکھنے والے افسانہ نگاروں کی کبھی کمی نہیں رہی۔ یہ رنگارنگی اور ہمہ جہتی اردو افسانے کی زندگی کو استحکام بخشنے میں بہت معاون رہی۔ افسانے کی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ مشینی عہد میں قصّہ گوئی کی اس سے مختصر کوئی اور شاخ نہیں۔

مختصر صنفوں کو عملی طور پر یہ فائدہ ملتا ہے کہ اُن کے قارئین یا سامعین کی تعداد اچھی خاصی ہوتی ہے۔ مثنویوں کے مقابلے غزل کو یہ فائدہ ملا۔ ایک شعر سنا کر غزل کا شاعر اپنی بات پہنچا سکتا ہے۔ ادیبوں، شاعروں کو جو سماجی مواقع ملتے ہیں، اُن

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

میں نثر کے مقابلے شاعری کو یہ فائدہ ملتا ہے۔ نثر کے ارتقا کے ساتھ جب نثری محفلوں کے مواقع پیدا ہوئے تو سب سے زیادہ افسانوی محفلوں کو فروغ حاصل ہوا۔ جتنے وقت میں ایک شاعر تین چار نظمیں اور چند غزلیں سناتا ہے، اُسی وقت میں ایک افسانہ نگار اپنا افسانہ پیش کرسکتا ہے۔ اِس وجہ سے افسانوں کی مقبولیت بڑھ گئی۔ جس طرح کسی سلگتے ہوئے موضوع پر شاعر ایک شعر کہہ کر داد وصول کر لیتا ہے، اُسی طرح افسانہ نگار بھی مختلف مواقع سے اپنی اس مہارت کا استعمال کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اس وجہ سے بھی افسانوں کو توجہ سے پڑھا گیا۔ ناول اور داستانوں میں اِس کی گنجایش کم سے کم ہے کہ کسی مختصر یا ہنگامی موضوع پر لکھنے والا اپنے تبصرے پر مائل اور پڑھنے والے اُسی ارتکاز کے ساتھ اُس پر غور کرسکیں۔ اِس لیے داستان یا ناول اپنی دوسری خصوصیات کی وجہ سے اہمیت حاصل کرتے ہیں۔

اردو افسانے کی عمر ایک صدی سے زیادہ نہیں۔ شعروادب کی تاریخ میں اِسے ایک مختصر میعاد کہتے ہیں لیکن اس صنف کی مقبولیت اور اردو میں موجود سرمایے کو دھیان میں رکھیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہزار برسوں سے زیادہ اس صنف کی عمر ہوگئی۔ غزل کی طویل تاریخ ہے اور ہم میر، غالب کے بعد معیار کے اعتبار سے فہرست میں اگلا نام پیش کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔ لیکن ایک سو سال کی صنف ہونے کے باوجود پریم چند، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کے نام ذہن پر زور دیے بغیر آجاتے ہیں۔ مثنویوں کا سفر پانچ سو سال سے زیادہ کا ہے۔ ملّا وجہی، میر حسن اور دیا شنکر نسیم کے آگے لب نہیں کھلتے۔ قصیدے میں سودا اور ذوق کے بعد فہرست نگار خاتمے کا اعلان کردیتے ہیں۔ مرثیے میں انیس اور دبیر کے بعد زبان گُنگ ہو جاتی ہے۔ ناول میں پریم چند، قرۃ العین حیدر اور عبداللہ حسین کے بعد اتنا بڑا کون ہے۔ یہ تفصیل واضح کرتی ہے کہ افسانے میں لکھنے والوں کی ایک فوج سامنے آئی اور معیاری یا شہ کار تخلیق کرنے والے صفِ اوّل کے اہلِ قلم بڑی تعداد میں اس صنف کی طرف پُرکشش انداز میں دیکھتے رہے۔ یہ کہنا چاہیے کہ مختصر افسانے کے جنم نے اردو کی ادبی محفل میں وہ طوفان کھڑا کیا جس کے مقابل کم اصناف ٹھہر پائیں۔ سب سے زیادہ تیز روی اِسی صنف نے دکھائی۔ اِسی وجہ سے مختصر افسانے نے مقبولیت اور پایۂ اعتبار دونوں حاصل کیا۔ آنے والے وقت میں زندگی کی پیچیدگیوں کو مکمل طور پر برتنے کی صلاحیت رکھنے کی وجہ سے بہترین ناول نگاری کے امکانات سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن زمانے کی برق رفتاری اور رفتہ رفتہ آدمی کے پاس وقت کے سمٹتے منظروں کے سبب غزل اور مختصر افسانے سے قربت رکھنے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں ہوگا۔ افسانہ مؤثر اور شفاف انداز میں آیندہ بھی لکھا جاتا رہے گا۔

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
© Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

مختصر گفتگو

۱۔ ''مختصر افسانہ زندگی کی ایک قاش ہے'' واضح کیجیے۔

۲۔ ''مختصر افسانہ'' کے اجزاے ترکیبی سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔

۳۔ مجموعہ ''انگارے'' کب شائع ہوا۔اس مجموعے کے مصنّفین کے نام لکھیے۔

۴۔ اردو کے دس ترقّی پسند افسانہ نگاروں کے نام بتائیے۔

۵۔ اردو کی پانچ خواتین افسانہ نگاروں کے نام قلم بند کیجیے۔

۶۔ پریم چند، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی کے تین تین افسانوں کے عنوانات لکھیے۔

تفصیلی گفتگو

۱۔ اردو کا پہلا افسانہ نگار کس تخلیق کار کو کہا جاسکتا ہے؟ مدلّل لکھیے۔

۲۔ پریم چند کے افسانوں کی خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

۳۔ ''ترقّی پسند افسانہ نگاری'' کے موضوع پر ایک مضمون قلم بند کریں۔

۴۔ فسادات کے موضوع پر لکھے گئے چند افسانوں سے اپنی واقفیت کا اظہار کریں۔

۵۔ 1980 کے آس پاس کے افسانہ نگاروں کو جدیدیت کے دور کے افسانہ نگاروں سے الگ راستہ کیوں اختیار کرنا پڑا؟ موجودہ دور میں سرگرم افسانہ نگاروں کے نام بھی درج کیجیے۔

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime

Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime

Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

HISTORY OF URDU LANGUAGE AND LITERATURE

For Class XI & XII

BIHAR STATE TEXTBOOK PUBLISHING CORPORATION LTD., PATNA
बिहार स्टेट टेक्स्टबुक पब्लिशिंग कॉरपोरेशन लिमिटेड, बुद्ध मार्ग, पटना

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...